عہدِ نبوی کے
غزوات و سرایا اور اُن کے مآخذ پر ایک نظر

سعید احمد اکبر آبادی

(۱)

اگرچہ مقالہ کا موضوع بحث غزوات و سرایا ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری پیغمبرانہ زندگی شروع سے آخر تک اس طرح مربوط و مسلسل ہے کہ اس کے کسی جزو کو دوسرے اجزاء سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، اس کی نوعیت، مکہ کی زندگی اور پھر ہجرت کا تذکرہ مختصراً کر دیا جائے۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مغربی مصنفین[۱] جنھوں نے اسلام اور سیرتِ

---

[۱] ان میں وہ مستشرقین شامل نہیں ہیں جنھوں نے اسلام یا حضور کی سیرت پر کتابیں لکھی ہی نہیں اسلام کے خلاف سخت معاندانہ پروپیگنڈہ کرنے کی غرض سے اور اس لئے واقعات کو توڑ موڑ کر اور اصل حقائق کو مسخ کر کے انھوں نے اپنی خباثتِ نفسی اور دنائتِ طبع کا سخت المناک مظاہرہ کیا ہے، ان لوگوں کی پروفیسر گب، پروفیسر آربری اور ہمارے زمانے کے فاضل مستشرق پروفیسر منٹگمری نے بھی سخت مذمت کی ہے۔

مقدسہ پر علمی اور تحقیقی انداز پر کتابیں لکھی ہیں۔ اور لب و لہجہ سنجیدہ اور متین رکھا ہے چونکہ ان کا ذہن نبوت اور رسالت کے تصور سے خالی ہے۔ اس بنا پر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا جائزہ ایک عظیم انسان، ایک عظیم مفکر اور ایک عظیم رفارمر اور مقنن کی حیثیت سے لیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غزوات و سرایا کا رشتہ بھی حضور کی اس حیثیت کے ساتھ جوڑ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے۔ کہ آپ نہایت بلند حوصلہ اور صاحب عزم انسان تھے۔ فاتح اور سیاست کے ماہر تھے۔ جنگ کے طریقوں سے خوب واقف تھے یہ سب چیزیں اپنی جگہ کیسی ہی درست ہوں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ حیثیت کو نظرانداز کر جانے کے باعث یہ حضرات ان غزوات و سرایا کے ان پہلوؤں اور سیرتِ نبوی کے ان گوشوں سے قصداً یا بلا قصد کے اغماض کر جاتے ہیں۔ جن سے ان غزوات کی اصل حیثیت و نوعیت متعین ہوتی ہے۔ اور جو ایک پیغمبر اور فاتح و کشورکشا کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتے ہیں۔ غور کیجئے کہ بدر کا معرکۂ کارزار بپا ہے۔ ایک طرف عرب کے بہترین جنگ آزماؤں کی فوج گراں نوسو کی تعداد میں سازوسامان سے آراستہ اور مکمل طور پہ ہتھیار بند ہے اور دوسری طرف صرف تین سو تیرہ انسانوں کا ایک دستہ ہے۔ جس کے پاس نہ پورے ہتھیار ہیں اور نہ ضروری سازوسامان۔ جنگ اپنے شباب پر ہے دونوں طرف سے تلواریں چل رہی ہیں اور نیزے لپک رہے ہیں۔ لاشیں تڑپ تڑپ کر گر رہی ہیں۔ زخمی بدن سے خون کے فوارے ابل رہے ہیں۔ لیکن اسی عالم کرب و اضطراب میں اسی بے سروسامان فوج کا قائدِ اعظم بارگاہِ خداوندی میں خشوع و خضوع کا پیکرِ مجسم بنا سربسجود ہے اور اپنے مالک و آقا سے کہہ رہا ہے: اے خدا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تیری بندگی کرنیوالا کوئی نہ ہوگا۔ اسی عالم میں وہ آسمان کی طرف دیکھتا اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے: اے خدا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اُسے آج پورا کر۔ کوئی بتائے کہ

امید و بیم کے اس نازک ترین موقع پر یہ کیرکٹر بجز ایک پیغمبر برحق کے اور کس کا ہوسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اسی غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ اور حضرت ابو حسیل دو صحابی کہیں سے آرہے تھے کہ راستہ میں قریش نے روکا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کو جارہے ہو۔ انھوں نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر پورا واقعہ سنایا اور جنگ میں شرکت کی اجازت طلب کی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم ہر حالت میں وعدہ پورا کریں گے اور ہمیں صرف خدا کی مدد درکار ہے[1]۔ سوچنا چاہئے کہ سخت بے سروسامانی اور قلت تعداد کے باوجود اعلیٰ اخلاق کی یہ پاسداری اور خدا کی مدد پر یہ بھروسہ اور یقین کیا دنیا کے کسی بڑے سے بڑے فاتح میں بھی پائے جاتے ہیں؟ ہرگز نہیں ہ

بہرحال غزوات و سرایا کے یہی اسرار و رموز باطنی اور روحانی ہیں جو مغربی مصنفین اور ان کے متبعین سے ان کے علم و تحقیق کے باوجود مخفی رہ جاتے ہیں۔ اور اس بنا پر اس کوتاہ نظری پر غزوات و سرایا سے متعلق تحقیق و تفتیش کی جو عمارت قائم ہوتی ہے وہ غزوات کی صحیح عکاسی کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ غزوات پر گفتگو کرنے سے پہلے صاحب غزوات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت اور غزوات کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے تک کے حالات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

نبوت کسبی اور اختیاری منصب نہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات زندگی اور سیرت کے لئے قرآن مجید سے بڑھ کر مستند اور اعلیٰ و اشرف مآخذ اور کیا ہوسکتا ہے! نبوت سے پہلے کے آپ کے واقعات

---

[1] صحیح مسلم بحوالۂ سیرت النبی جلد اول ص ۲۹۷ -

حالات جو قرآن مجید میں مذکور ہیں ان سے چند مگر نہایت اہم یہ باتیں -

(۱) - آپ یتیم پیدا ہوئے تھے[۱]

(۲) - آپ کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد یہ حالت بہتر ہوگئی تھی -[۲]

(۳) - آپ امی تھے - نہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ دین اور ایمان کیا چیز ہے -

(۴) - آپ تلاشِ حق میں سرگرداں اور حیران و پریشاں تھے تو اللہ نے آپ کو سیدھا راستہ دکھایا یعنی پیغمبری عطا فرمادی[۳] -

ان آیات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ رسالت و نبوت کا کوئی تصور تھا نہ یہ آپ کا معاذاللہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ اور پروگرام تھا. نہ آپ اس منصب کے لئے تیاریاں کر رہے تھے - بلکہ یہ منصب اچانک اور آپ کی کسی توقع ، امید یا انتظار کے بغیر آپ کو سپرد کیا گیا - چنانچہ صحیح بخاری کے شروع میں ہی باب بدءالوحی کے زیرِ عنوان جو طویل روایت مذکور ہے اس کا مضمون بھی یہی ہے کہ غارِ حرا میں آپ کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا تھا آپ خود اس کی کوئی توجیہ نہیں کرسکے تھے - اور ایک غیر معمولی صورتِ حال کے پیش آجانے کے باعث آپ پر لرزہ طاری ہوگیا تھا - لیکن حضرت خدیجہؓ کی فراست اور اعلیٰ اقدارِ حیات پر جزم و یقین نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی اور ورقہ ابن نوفل سے گفتگو کے بعد اس کی تصدیق ہوگئی -

نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک ایک

---

[۱] - سورۂ والضحیٰ - [۲] ایضاً [۳] - ایضاً

قول اور عمل کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے مسئول اور جواب دہ تھے۔ اور اب آپ کا جو قدم اٹھتا تھا اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اور اس کی نگرانی میں اٹھتا تھا۔ اپنی رسالت کا اعلان فرمایا تو شروع میں (کم و بیش ایک برس کے اندر) باون حضرات مسلمان ہوئے لیکن ان میں سے اکثر کی عمر اس وقت بیس برس سے کم تھی اور ان کے خاندان کے بڑے بوڑھے سب کفر و شرک پر قائم تھے۔ نوجوانوں کے علاوہ کچھ غریب غربار تھے۔ اور کچھ غلام تھے۔ توحید کی دعوت نے مکہ کے لوگوں میں آگ تو لگا ہی دی تھی۔ یہ مسلمانوں کی سب سے پہلی جماعت ان کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گئی۔ جو غریب غربار یا یا تدی غلام تھے ان کا کوئی سہارا یا مددگار نہیں تھا۔ اس لئے ظلم و ستم اور جبر و تعدی کا منہ سب سے زیادہ انہیں کو دیکھنا پڑتا تھا۔ اس بنا پر دعوت اسلام شروع میں عام اور برملا نہیں بلکہ پوشیدہ تھی اسلام قبول کرنے والوں میں ارقم بن الارقم بارہویں نمبر پر تھے۔ ان کا مکان صفا کے دامن میں تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ سب حضرات انھیں کے گھر میں جمع ہوتے اور باہم مشورہ اور مذاکرہ کرتے تھے۔ یہ دعوتِ اسلام کا بالکل ابتدائی دور ہے۔ اس کی مدت تین برس ہے۔

دعوتِ اسلام کا دوسرا دور اس حالت پر کم و بیش تین برس گذرے تھے کہ اب دعوت کے عام اور علانیہ کر دینے کا فرمانِ الٰہی صادر ہوا۔ ارشاد ہوا۔

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین	آپ کو اب جو جو احکام ملتے رہیں انھیں کھل کر
وانذر عشیرتک الاقربین	بیان کیجئے اور مشرکین کی پرواہ نہ کیجئے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا کا خوف دلائیے

اس حکم کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ عام اور برملا

کردی اور اس کا آغاز اس طرح کیا کہ مکہ کی آبادی کے باہر سب اہلِ قریش کو ایک جگہ جمع کیا۔ اور ان کے سامنے پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ توحید اور بت پرستی کی مذمت بیان فرمادی۔ اسی طرح رشتہ داروں کو جمع فرمایا اور ان کو ایمان و عملِ صالح کی دعوت دی۔ اس دعوتِ عام دبرملا کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے دلوں میں اندر ہی اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور دشمنی کی جو آگ سلگ رہی تھی۔ اب وہ کوہِ آتش فشاں بن کر یک بیک پھٹ پڑی۔ اسلام کی تاریخ کا پہلا دن تھا جب کہ دینِ قیم کے مقابلہ پر باطل نے اپنی جمعیت کی صف آرائی کا اعلان کردیا۔ اور ہمیں کہنا چاہیئے کہ اب سے دس برس کے بعد جن غزوات کا سلسلہ شروع ہوا ان کا طبلِ جنگ درحقیقت اسی وقت بج گیا تھا

ایک اہم نکتہ اس موقعہ پر خاص طور سے یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اگر عام حالات ہوتے تو اسباب ظاہری کے پیشِ نظر قریش کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے عہدہ برآ ہونا چنداں مشکل نہیں تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ اس زمانے میں قبائلی زندگی کے جن آداب و ضوابط میں جکڑے ہوئے تھے ان کی وجہ سے قریش کے لئے من مانی کرنا آسان نہیں تھا۔ ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم اور حضرت خدیجہؓ آپ کی زوجۂ محترمہ تھیں اور یہ دونوں قریش کی برادری کے نہایت اہم اور معزز رکن تھے۔ اس لئے جب تک حضور کو ان دونوں کی حمایت اور حفاظت حاصل تھی یہ لوگ حضور کو قتل نہیں کرسکتے تھے۔ اس بنا پر اب قریش نے باہم مشورہ کے لئے متعدد اجتماعات منعقد کئے اور ہر مرتبہ کوشش کی کہ ابوطالب حضور کی حمایت سے دست بردار ہوجائیں مگر ایسا نہ ہوا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ستانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کئے۔ آپ کو ساحر اور کاہن مشہور کیا۔ اپنے

اور دوسرے قبیلوں کے لوگوں کو آپ کے پاس جانے سے روکا آپ کے غریب ترین ساتھیوں کو سخت ترین جسمانی اذیتیں پہنچائیں ۔ چچا ابو طالب نے جب یہ دیکھا تو اپنی قوم کو حضور کی حمایت کی دعوت دی بنی عبدالمطلب ، بنی ہاشم ، اور بنی عبد مناف ان سب نے ابولہب کو مستثنیٰ کر کے اس دعوت کو قبول کیا ۔

ہجرت حبشہ

ان قبائل کی حمایت کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی تحفظ تو سردست ہو گیا لیکن اور اذیتوں میں کمی نہیں ہوئی اور ادھر صحابۂ کرام کے لئے روز بروز زندگی دشوار ہوتی جا رہی تھی ۔ اس لئے آپ نے ان حضرات کو حبشہ کی ہجرت کا مشورہ دیا یہ ہجرت دو مرتبہ ہوئی ہے ۔ اولاً بارہ مرد اور چار عورتیں نبوت کے پانچویں برس ماہ رجب میں حبشہ گئے ۔ انھوں نے وہاں دو مہینے قیام کیا تھا کہ انھیں معلوم ہوا کہ اسلام مکہ میں پھیلنے لگا ہے ۔ یہ سن کر مہاجرین واپس آگئے ۔ لیکن مکہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی اور قریش اسلام کی عداوت اور دشمنی میں پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں ۔ اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دوبارہ حبشہ جانے کا مشورہ دیا ۔ چنانچہ پہلے حضرت جعفر ابن ابی طالب اور پھر دوسرے مسلمان یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے ۔ بعض حضرات اپنے متعلقین کے ساتھ تھے ۔ اور بعض تنہا ۔ اب جو مسلمان وہاں پناہ گزین تھے ، عام اور مشہور روایت کے مطابق ان کی تعداد تراسی یا چوراسی بیان کی جاتی ہے ۔

قریش نے مہاجرین کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا ۔ دو آدمیوں کا وفد بھیج کر کوشش کی کہ شاہ حبشہ مہاجرین کو اپنے ملک سے نکال دے ۔ لیکن اس مشن میں ان کو ناکامیابی ہوئی اور شاہ نے مہاجرین کے نمائندہ حضرات سے گفتگو کے بعد ان مسلمانوں کو مکہ واپس کرنے سے انکار کر دیا

شعب ابی طالب اس مایوسی اور ناکامی نے قریش کی جلتی پر تیل کا کام کیا اور ادھر حضرت عمرؓ مسلمان ہو چکے تھے۔ جس کے باعث مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اور وہ علانیہ عبادت کرنے لگے تھے۔ اِس صورتِ حال پر قریش قابو سے باہر ہو گئے۔ اور اب ان لوگوں نے ایک تحریری معاہدہ کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کا سوشل بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا۔ عہدنامہ جو خانہ کعبہ پر آویزاں کیا گیا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ بنوہاشم اور بنوالمطلب کی لڑکیوں کے ساتھ نہ کوئی عقد کرے گا اور نہ ان کو اپنی لڑکی دیگا۔ ان سے نہ کوئی چیز خریدی جائے گی۔ اور نہ کوئی چیز ان کے ہاتھ فروخت ہوگی۔ جناب ابوطالب کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مذکورہ بالا دونوں خاندانوں کے لوگوں کو مع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لے کر شعب ابی طالب میں چلے گئے جو مکّہ کے پہاڑوں میں ایک درّہ اور بنوہاشم کا موروثی مِلک تھا۔ یہ واقعہ نبوت کے ساتویں برس ماہ محرم کا ہے۔

اس موقع پر دو باتیں خاص طور پر یاد رکھنے کی ہیں جو عام سیرت نگاروں سے نظرانداز ہو گئی ہیں۔ (۱)۔ ایک یہ کہ قریش نے بنوہاشم اور بنوالمطلب کے مقاطعہ کا جو عہدنامہ لکھا تھا عام مورخین سیرت اور اربابِ روایت کے مطابق اس کے الفاظ وہی ہیں جو ہم نے اوپر لکھے ہیں۔ البتہ مولانا شبلی نے (سیرت النبی ج ۱ ص ۲۴۵) ان الفاظ پر "جب تک وہ (بنوہاشم) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لئے حوالہ نہ کریں گے"، کا اضافہ کیا ہے، لیکن اس اضافہ کی نسبت مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ یہ الفاظ صرف "مواہب لدنیہ" میں مذکور ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بعینہٖ یہی الفاظ حافظ ابن عبدالبر کی کتاب "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" میں بھی موجود ہیں۔

---

[۱] ص ۵۷، ۶۰ - مولانا شبلی نے "صرف مواہب لدنیہ" اس لئے لکھا ہے

(باقی صفحہ ۳۷۵ پر)

علمار کا اتفاق ہے کہ سیرت مقدسہ میں سب سے زیادہ مستند اور معتمد علیہ وہ کتابیں ہیں جو محدثین نے لکھی ہیں اور حافظ ابن عبدالبر جس پایہ کے محدث ہیں ارباب نظر پر پوشیدہ نہیں۔ پھر مواہب لدنیہ کے مصنف علامہ قسطلانی کے بلند پایہ محدث ہونے میں بھی کلام نہیں۔ وہ صحیح بخاری کے مشہور شارح ہیں۔ ہم نے کتب سیرت کا استقصا نہیں کیا۔ ورنہ ممکن ہے کہ یہ الفاظ اور بعض کتابوں میں بھی موجود ہوں بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ اب اسلام کی ترقی اور اشاعت اور اپنی تمام کوششوں کی ناکامی و نامرادی نے قریش کو اس درجہ بوکھلا دیا تھا کہ وہ حضور کی جان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اور اس کے علاوہ ان کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی تائید بعض اور روایات سے بھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بنو ہاشم اور بنی المطلب ان سب کا عام مقاطعہ اور جناب ابو طالب کا اس پر یہ اہتمام کہ سب کو لے کر شعب ابی طالب میں چلے گئے۔ یہ بھی اس بات کی صاف دلیل ہے کہ معاملہ انتہائی نازک اور سنگین تھا۔ یعنی یہ لوگ حضور کے قتل کے درپے تھے۔ اور اب اس سے کم کسی چیز پر وہ راضی نہیں ہو سکتے تھے۔

(۲)۔ دوسری اہم چیز جو اس واقعہ میں لحاظ کے قابل ہے یہ ہے کہ شعب ابی طالب میں جن لوگوں نے پناہ لی وہ دو ایک آدمیوں کو مستثنیٰ کر کے بنو ہاشم اور بنو المطلب کے سب لوگ تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اور وہ بھی تھے جنھوں نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ پہلا طبقہ تو اپنے دین کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۴) کہ حافظ ابن عبدالبر کی کتاب اُن کے زمانہ میں طبع نہیں ہوئی تھی اور اُس کا مخطوطہ اُن کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر شوقی ضیف کی تصحیح و تعلیق سے ابھی ۱۹۶۶ء میں قاہرہ میں طبع ہوئی ہے۔

لئے یہ سب آفات و شدائد برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا تھا۔ لیکن دوسرے طبقے کے لئے باعث اور محرک کیا تھا جس کی وجہ سے وہ سب سختیاں انگیز کررہے تھے؟ عام خیال یہ ہے کہ اس کا سبب قبائلی حمیّت تھا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن ذرا گہرائی میں جائیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا ایک بڑا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی جاذبیت اور کشش اور اس کے ساتھ ہی حضور کے کردار اور عمل اور آپ کی بے لوث و بے غرض زندگی کا اثر بھی تھا۔ اگرچہ اب تک ان لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن ان کے دل بے شبہ متاثر تھے۔ ابوطالب نے موت کے وقت جن احساسات کا اظہار کیا تھا۔ ہمارے نزدیک کم وبیش اس وقت یہی احساسات ان سب لوگوں کے تھے۔

شعب ابی طالب میں ان سب لوگوں کا قیام جن میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی تین برس کے قریب رہا۔ اس مدت میں وہ کونسی تکلیف تھی جو انھوں نے نہیں اٹھائی۔ اور وہ کونسی سختی اور اذیت تھی جو انھوں نے برداشت نہیں کی۔ لیکن کیا مجال کہ ان کے پائے صبر واستقلال میں کوئی لرزش پیدا ہوئی ہو۔ مظلومیت کا کمال یہ ہے کہ خود ظالم کو رحم آجائے آخر دشمنوں میں چند لوگوں نے عہدنامہ منسوخ کردینے کی تحریک کی۔ اور بڑی ردوکد اور بحث وگفتگو کے بعد ایک شخص مطعم بن عدی نے سبقت کی اور عہدنامہ کو چاک کردیا۔ پھر ایک روایت کے مطابق یہی مطعم چند اور سرداران قریش کے ساتھ ہتھیار بند ہوکر شعب ابی طالب پہونچے اور محصورین کو وہاں سے نکال لائے۔

عام الحزن

اب بنو ہاشم اور بنو المطلب کو ان آلام و تکالیف سے تو نجات مل گئی جس میں اب تک مقاطعہ کے باعث وہ مبتلا رہے تھے۔ لیکن اسی برس یعنی سنہ ۱۰ میں ایک طرف ابوطالب اور دوسری جانب حضرت خدیجہؓ

کا چند مہینوں کے فصل سے آگے پیچھے انتقال ہوگیا۔ نظر بہ اسباب ظاہری یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موجودہ صبر آزما حالات میں بہت بڑا سہارا تھے۔ اور یوں بھی ابوطالب نے جس محبت و شفقت کے ساتھ بچپن میں آپ کی پرورش کی اور عہد شباب میں آپ کے ساتھ ہر قسم کی خیراندیشی اور غمگساری کا معاملہ کیا اور نبوت کے بعد دشمنوں کے مقابلہ میں ہر وقت وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دل و جان سے سینہ سپر رہے ان سب وجوہ کی بنا پر وہ کہنے کو چچا تھے لیکن درحقیقت باپ سے کم نہیں تھے۔ رہیں حضرت خدیجہؓ! تو انہوں نے حضور کے ساتھ جس غیر معمولی محبت، ہمدردی و غم گساری اور امداد و اعانت کا معاملہ کیا تھا اس کی اہمیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں حضور کو مخاطب کر کے ووجدک عائلاً فاغنیٰ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے اس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اس بنا پر ان دونوں کی بیک وقت جدائی کا جو غم اور رنج و ملال ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ حضور نے اس سال کو عام الحزن یعنی غم کا سال فرمایا۔

لیکن جو دنیا کا غم کھانے اور ان کا دکھ درد دور کرنے کیلئے آیا تھا اُسے اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں اپنے ذاتی رنج و غم کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ آپ نے اپنا کام جاری رکھا اور اس کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوگئی۔

طائف کا سفر قریش کی ایذا رسانی اور تبلیغ و اشاعت اسلام کی راہ میں رکاوٹیں اور دشواریوں میں روز بروز شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے باہر دوسرے قبیلوں کو دعوت اسلام دینے کا خیال فرمایا۔ مکہ مکرمہ سے پچاس میل کے فاصلہ پر

لہ۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

طائف تھا۔ یہ نہایت سرسبز و شاداب مقام تھا۔ آب و ہوا بہت عمدہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموؤں کا خاندان عبد یالیل یہیں آباد تھا۔ اس لئے حضور نے اپنے خادم خاص حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ اس مقام کا رُخ کیا لیکن یہاں کے رؤسا اور امرا آپ کے ساتھ نہایت گستاخی اور بدتمیزی سے پیش آئے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ آبادی کے چند چھوکروں اور لڑکوں کو آپ کے خلاف ورغلا دیا۔ یہ لوگ دو رویہ صف بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اور جب حضور ان کے درمیان میں سے گزرے تو انھوں نے اتنی سخت سنگباری کی کہ آپ کے دونوں پاؤں سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔ اس عالم میں آپ ایک باغ میں پہنچکر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ لیکن یہاں ربیعہ کے دو لڑکے عتبہ اور شیبہ پہلے سے موجود تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی دشمنی اور اسلام

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ڈاکٹر حمید اللہ نے "عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ" میں صفحہ ۱۰ پر یہی فاصلہ لکھا ہے لیکن ڈاکٹر جواد علی نے تاریخ العرب قبل الاسلام۔ ج ۴۔ ص ۲۰۹ پر ۷۵ میل لکھے ہیں۔ ممکن ہے ان دونوں میلوں میں وہی فرق ہو جو آج کل میل اور کیلومیٹر میں ہوتا ہے۔ بہرحال طائف مکہ سے جنوب مشرق میں سطح مرتفع پر قائم ہے۔ اور اس زمانہ میں اور اب بھی یہ مکہ کا شملہ ہے یعنی اہل مکہ گرمیوں کا موسم یہیں گزارتے ہیں۔ قرآن مجید میں "القریتین" کا جو لفظ آیا ہے بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مکہ کے ساتھ دوسرا قریہ طائف ہی مراد ہے اسلام کے ظہور کے وقت اس جگہ کے باشندوں کی غالب اکثریت قبیلۂ ثقیف کی طرف منسوب تھی۔ اس قبیلہ کے زعماء نے حضور کے ساتھ یہ سخت ظالمانہ اور بیرحمی کا برتاؤ کیا تھا۔ بنو امیہ کا مشہور سفاک اور ظالم حجاج اسی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔

کے خلاف شدید نفرت کا علم تھا۔ انھوں نے آپ کی شان میں نہایت گستاخانہ الفاظ کہے تو آپ یہاں سے بھی اٹھکر واپس ہو گئے۔

جوار عرب میں باقاعدہ حکومت کا رواج تو تھا نہیں، قبائلی نظام قائم تھا اس بنا پر اگر کسی شخص کو جان و مال کی حفاظت (Protection) درکار ہوتی تھی تو اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی قبیلہ کے سربراہ اور سردار کی پناہ میں دے دیتا تھا۔ اور عربی میں اس کو ہی جوار کہتے تھے۔ جب تک ابوطالب زندہ رہے حضور ان کی پناہ میں رہے۔ ابوطالب کے انتقال کے بعد خاندان کا بزرگ اور آپ کا چچا ابولہب تھا۔ لیکن یہ پہلے سے ہی آپ کا جانی دشمن تھا۔ چنانچہ ابوطالب اور بنو ہاشم کے ساتھ شعب ابی طالب میں بھی نہیں گیا تھا اور اب حضور کی حفاظت سے دست بردار ہو گیا تھا۔ اس بنا پر مکہ میں رہنے کے لئے حضور کو جوار کی ضرورت تھی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے جسے حافظ ابن عبد البر (الدرر ص ۶۵) نے نقل کیا ہے۔ کہ ” ان برسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو مختلف قبیلوں کے سامنے پیش فرماتے اور ان سے جوار کی درخواست کرتے تھے لیکن ان میں کوئی اس پر رضامند نہیں ہوا۔ اور ہر ایک نے یہی جواب دیا کہ وکیف یصلحنا من افسد قومہ یعنی جس شخص نے اپنی ہی قوم میں فساد پیدا کر دیا وہ ہماری اصلاح کیونکر کریگا۔ آخر حضور طائف سے واپسی میں جب حرار تشریف لائے اور یہاں عرب کے ایک سردار مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف سے بھی درخواست کی تو مطعم فوراً اس کے لئے تیار ہو گئے۔ بیٹوں کو بلا کر حکم دیا کہ ہتھیار بند ہو کر حرم میں جاؤ اور اب وہ خود اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ آیا اور حرم کے پاس کھڑے ہو کر باواز بلند کہا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس واقعہ کو

نقل کرنے کے بعد اپنے قیاس سے لکھا ہے "مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس پناہ دہی کے معاوضہ میں یہ اقرار کرنا پڑا کہ شہر میں تبلیغی تقریریں نہیں کی جائیں گی۔ (عہد نبوی کا میدانِ جنگ ص ۱۲) ڈاکٹر صاحب نے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا اور نہ اس طرح کی کوئی شرط کسی کتاب میں ہماری نظر سے گذری ہے۔ اس لئے اگر یہ فقط ڈاکٹر صاحب کا قیاس ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ درست نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ مطعم بن عدی کی پناہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں تبلیغی سرگرمی کا سُراغ نہیں ملتا لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ نے جوار کی شرط کے ماتحت اپنے اوپر مکہ میں تبلیغ نہ کرنے کی پابندی عائد کرلی تھی بلکہ اس کے وجوہ حسب ذیل تھے۔

(۱)۔ آپ اہل مکہ کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور ان کو ختم اللہ علی قلوبھم---- کا مصداق سمجھتے تھے۔

(۲)۔ مطعم بن عدی آپ کا محسن تھا جس نے اس درجہ سخت صبر آزما حالات میں پناہ دی تھی۔ اس بنا پر آپ کے حسنِ اخلاق اور احسان شناسی کا تقاضہ تھا کہ آپ مکہ میں تبلیغی سرگرمی کو جاری رکھکر مطعم کو کسی شدید ابتلا میں گرفتار نہ ہونے دیں[1]۔

قبائل کا دورہ

ان وجوہ کی بنا پر اب آپ کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لیے نئے

---

[1] مطعم نے حضور کو صرف پناہ نہیں دی بلکہ جیسا کہ روایات میں ہے اس کا بھی اہتمام کیا کہ مطعم خود اور اسکی اولاد حرم میں مسلح رہتی تھی اور آپ ان لوگوں کی حفاظت میں حرم میں نماز پڑھتے تھے یہی وجہ تھی کہ اگرچہ مطعم مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن جب اس کا انتقال ہوا تو حضرت حسان بن ثابت نے اسکا مرثیہ لکھا زرقانی علی المواھب ج ۱۔ ص ۵۱۶ ۔

گوشے اور نئی جگہیں تلاش کریں چنانچہ آپ نے یہی کیا۔ حج کے زمانے میں سارے عرب سے قبائل آتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقام منا میں ان قبائل سے ملاقات کرتے ان کو اسلام کی حقیقت سمجھاتے اور اسے قبول کرلینے کی دعوت دیتے تھے۔ اور آپ نے ان لوگوں سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ حضور کو اپنے ملک میں لے چلیں تاکہ آپ وہاں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام اطمینان سے کرسکیں۔ آپ نے ان کو یہ مژدہ بھی سنایا کہ اگر انھوں نے اسلام کو قبول کرلیا تو وہ جلد ہی پورے عرب کے سردار بلکہ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہوجائیں گے۔ آپ نے اس سلسلہ میں جن قبائل سے گفتگو کی مورخین نے انکی تعداد پندرہ یا سولہ لکھی ہے۔ اس کے علاوہ عکاظ، المجنہ اور ذوالمجاز عرب کے مشہور میلے جو سالانہ لگتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان میلوں ٹھیلوں میں بھی تشریف لے جاتے اور لوگوں کو اپنی دعوت سے روشناس کرتے تھے لیکن قریش کے سردار اور خصوصاً ابولہب ان مواقعوں پر بھی آپ کا تعاقب کرتے اور قبائل کو کبھی ڈرا دھمکا کر، کبھی حضور کا مذاق اڑا کر، غرض جس طرح بن پڑتا حضور کی دعوت کو قبول کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ اور کسی پر اثر نہیں ہوا۔ اور انھوں نے دعوتِ اسلام رد کردی۔ (باقی)

اِدارہ ندوۃ المصنفین دھلی کے قواعد و ضوابط اور فہرست کتب مفت طلب فرمائیے

مینیجر ندوۃ المصنفین اُردو بازار جامع مسجد دہلی